علامہ محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی
نثر الأزھار علی شرح معانی الآثار..... چند خصوصیات وامتیازات

مولوی جمیل احمد، کراچی

سرزمین ہند میں علامہ علی متقی ہندی، علامہ محمد طاہر پٹنی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ کی جدوجہد کے نتیجے میں علم حدیث کی ترویج وارتقا کے بعد رونما ہونے والے تجدیدی کارنامے علمائے برصغیر کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس نے علمائے حجاز کے مکاتب حدیث میں پہلی مرتبہ ایک بڑی سطح پر علمائے ہند کے تفوق فی علوم الحدیث کی صدائے بازگشت سنوائی، یوں تو مذکورہ نمایاں شخصیات کے علاوہ محدث عطاء اللہ سندھی، امام ابوالحسن سندھی اور ملا اکرم نصرپوری جیسی نابغہ روزگار شخصیات بھی سرزمین ہند ہی کا سرمایہ افتخار تھیں، لیکن ایک طویل عرصے بعد وسیع دائرے میں ہونے والی تبدیلی میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور خانوادہ شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کے بعد جو امتیاز شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے تلامذہ کو حاصل ہے وہ اسلامی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے، پھر حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے سینہ بے کینہ پر خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ہونے والی معونات بھی تکوینی طور پر ایک لطیفہ خداوندی کا مظہر ہیں، جس سے ایک طرف علوم حدیث کا فیضان، سبک رفتاری سے اہل ہند کے قلوب میں جاں گزیں ہوا، وہیں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی مذہب حنفیت پر اٹھنی والی 'مخالفت فی الحدیث' کی مسموم ہوائیں بھی موافقت میں تبدیل ہوگئیں، چنانچہ علوم کشمیری خدا کی عطا کردہ امانت تھے جس کا تحفظ ان کے تلامذہ نے ایک بڑی حد تک کیا، لیکن جس معیار پر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے حق امانت ادا کیا، اس پر یقیناً خود علامہ کشمیری بھی فخر کرتے ہوں گے۔ رحمهما الله رحمة واسعة.

بہرحال حضرت بنوریؒ، جانشین کشمیریؒ کی حیثیت سے پاک وہند میں علوم حدیث کی ترویج کے حوالے سے رکن رکین تھے، "معارف السنن" میں حضرت کا اختیار کردہ انداز بیان واستدلال تحقیق کے درجے کا کرتا ہے، بلاشبہ اگر صاحب کتاب کا نام، کتاب کے سرورق سے حذف کردیا جائے تو ایک سنجیدہ اور محقق طالب علم کو ایک لمحے

ضرور یہ کھٹکتا ہے کہ مصنف کتاب ضرور حافظ جمال الدین زیلعی یا ابن الہمام رحمہما اللہ کے پائے کا کوئی عالم ہوگا، پھر حضرت بنوری رحمہ اللہ کے علوم سے استفادہ کرنے والے تو بلاشبہ ہزاروں میں ہیں، لیکن حضرت بنوری کے مزاج کے مطابق ان کے علوم کے حامل تلامذہ کا حلقہ بہت محدود ہے، ان میں سرفہرست امین علوم محدث العصرؒ، حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی ذات باسعادت ہے، حضرت بنوری کو حضرت شہید پر جس قدر اعتماد تھا وہ اس پر پورا اترے، رسمی طالب علمی کی تکمیل کے بعد حضرت شہید نے حضرت بنوریؒ سے جو استفادہ کیا وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تھا، جس نے انہیں بہترین نقاد و محقق کے ساتھ عصر حاضر کے محدثین میں ایک نمایاں مقام تک پہنچایا، 'معارف السنن' کی تصنیف کے زمانے میں حضرت بنوری کے مکمل اعتماد کی بنا پر حضرت شہید ان کے علمی معاون اور شریک کار تھے۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی صحبت نے حضرت شہید کے مزاج و مذاق اور سوچ و فکر میں وہ بلندی پیدا کی جس کی بنیاد پر وہ ایک عظیم شیخ کے عظیم شاگرد قرار پائے، چنانچہ خود حضرت بنوری رحمہ اللہ بے پناہ صلاحیتوں اور قابل قدر خدمات کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید اور حضرت شہید رحمہما اللہ کے بارے میں بارہا فرمایا: "**هما جناحای فی التصنیف**" (تصنیفی میدان میں یہ دونوں میرے دست و بازو کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ پھر تو یہ جملہ ان شیخین کے لیے گویا لقب کی حیثیت اختیار کر گیا، حضرت بنوری رحمہ اللہ یکتائے روزگار اور محقق مزاج عالم تھے، اس لیے ان کی زبان سے اپنے شاگردوں کے حق میں یہ جملہ معنی رکھتا ہے، اس بلند پایہ تعریفی و سندی جملے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح پرندہ کی آزادانہ پرواز اس کے پروں کے بل بوتے پر ہوا کرتی ہے، اسی طرح شیخین کریمین، حضرت کے فیوض و معارف کی نشر و اشاعت کے حوالے سے ان کا سرمایہ تھے اور پھر وقت نے یہ بات ثابت کر دی کہ واقعتاً جن بازوؤں پر اعتماد تھا وہ سچا ثابت ہوا، "**کشف النقاب**" اور "**نثر الازھار**" جیسی مفید اور شاہکار تحقیقات اس فیض علمی کا منہ بولتا ثبوت ہے، ذیل میں ہم "**مشتے نمونہ از خروارے**" کے طور پر **نثر الازھار** سے چند اہم نکات مع امثلہ پیش کریں گے، جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شہید اپنے تحقیقی منہج میں "**معارف السنن**" کی راہ پر ہی گامزن تھے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کی "نظر"

(۱) امام طحاویؒ اپنی مایہ ناز کتاب "**شرح معانی الآثار**" میں اختلافی مباحث سے اعتنا کرتے ہوئے خالص حدیثی و فنی امور کے ساتھ ساتھ الزامی طرز کا عقلی استدلال بھی پیش کیا کرتے ہیں، جو بلا ترتیب مقدمات، روایت سے درایت کی طرف رجوع کا نمونہ ہوا کرتا ہے، اس اسلوب کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ امام طحاوی رحمہ اللہ ایک ایسے ماحول کے فرد تھے جہاں علم حدیث کے درایتی پہلو سے اعتنا کم تھا، پھر اس زمانہ کا عمومی مزاج بھی ایسا ہی تھا، انہوں

نے اس بند باب کو کھولتے ہوئے، مسائل حدیثیہ میں ترجیح کی ایک نئی راہ اختیار کی، اس پہلو سے بلاشبہ وہ اپنے دور میں منفرد ہے، فقہ حنفی کی تائید میں ''نظر طحاوی'' کا ایک اہم کردار ہے، لیکن ترتیب مقدمات میں منطقی اسلوب کا اس زمانے میں رواج نہ تھا، اس لیے بعض اوقات ''نظر طحاوی'' گنجلک ہوکر عام ذہنوں کے لیے قیاس مع الفارق کی شکل اختیار کر جاتی ہے، اگر چہ گہرائی و گیرائی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات درست ہوتی ہے۔ مثلاً: ''باب فرض الرجلین فی وضوء الصلاۃ'' میں شیعہ امامیہ کی طرف سے عقلی شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ: ''قدمین کا حکم پانی کی موجودگی کی صورت میں مسح کا ہونا چاہئے، جیسا کہ وجود ماء کی صورت میں مسح علی الراس کا حکم ہے، اس لئے کہ عدم ماء کی صورت میں دونوں اعضاء کا حکم ایک ہے نہ کہ چہرہ اور بدن کی طرح کہ دونوں کا حکم عدم ماء کی صورت میں بدل کی طرف منتقل ہوتا ہے''۔ امام طحاویؒ اس شبہ کا نظری جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''خارج میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ شے کا حکم وجود ماء کی صورت میں غسل کا ہو، لیکن عدم ماء کی صورت میں اس کا حکم بلا کسی بدل کے رہ جاتا ہے، مثلاً غسل جنابت کا حکم وجود ماء کی صورت میں پورے جسم کا دھونا ہے، لیکن عدم ماء کی صورت میں حکم صرف چہرہ اور ہاتھوں کا مسح ہے نہ کہ پورے بدن کا مسح، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ جس چیز کا حکم عدم ماء کی صورت میں بغیر کسی بدل کے ہو تو یقیناً وجود ماء کی صورت میں اس کا حکم مسح کا ہوگا''۔ لیکن اس پر بعض محققین نے اشکال کیا ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ بھی انہیں اہل علم کی تائید کرتے ہیں، اس لئے کہ علامہ موصوف ''التعلیق الممجد'' میں جہاں امام طحاوی کے قدر دان نظر آتے ہیں، وہیں میدان تحقیق میں ان سے اختلاف کا اظہار بھی کرتے ہیں) اس اشکال کا حاصل یہ ہے: ''معترضین نے جو تک بندی کی ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ سر اور رجلین کا حکم جب عدم ماء کی صورت میں متحد ہے تو وجود ماء کی صورت میں بھی متحد ہونا چاہئے، اس نے اپنے اعتراض میں یہ شق شامل ہی نہیں کی کہ جب دونوں وجود ماء میں متحد ہیں تو عدم ماء کی صورت میں دونوں کا حکم مسح ہے''، گویا کہ معترض کا اصل منشا کلی تطبیق دینا ہے، جزوی قضیہ کی بنیاد پر مابہ الاشتراک کو ثابت کرنا نہیں ہے۔

ان اہل علم کا یہ اعتراض بظاہر بڑا جاندار معلوم ہوتا ہے، لیکن حضرت رحمہ اللہ کی بالغ نظری دیکھئے کہ ''نثر الازھار'' میں اس باب کے تحت ''تلخیص'' میں کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں کہ اعتراض کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے، حضرت لکھتے ہیں:

''یہ جو اعتراض کیا گیا کہ: ''بلا کسی بدل کے پانی موجود نہ ہونے کی صورت میں رجلین کا حکم ساقط ہوکر رہ جاتا ہے''، اس کا مقتضی تو یہ ہے کہ پانی موجود ہونے کی صورت میں دونوں کا حکم یکساں ہو، حالانکہ یہ بات قبول نہیں ہوسکتی، کیونکہ حالت جنابت میں پانی پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں باقی بدن کے ساتھ ساتھ رجلین کا دھونا بھی

تیمم علی الوجہ والیدین سے تبدیل ہوکر رہ جاتا ہے، حالانکہ قدرت علی الماء کی صورت میں بالاتفاق جنبی کے لیے پاؤں کا دھونا ضروری قرار دیا گیا ہے، لہٰذا پانی نہ ہونے کی صورت میں کسی عضو کا حکم اگر بغیر کسی بدل کے رہ جائے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا ہے کہ پانی موجود ہونے کی صورت میں اس کے مسح کا حکم ہوگا''۔ گویا حضرت نے اعتراض کی اصل منشا کو ظاہر کرنے کے بعد معترض کو حقیقت حال پر غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ (نثر الازھار، ۱: ۶۸ المکتبہ الیوسفیۃ)

(۲) اس باب میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے بظاہر صرف ایک نظر پیش کی ہے، حالانکہ روایات کے تسلسل میں انہوں نے ایک اور نظری پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جس کو صرف حضرت رحمہ اللہ نے محسوس کیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کی ہے: ''نظر بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دونوں پاؤں دھوئے جائیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل الرجلین کی فضیلت کو متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ پاؤں کا وظیفہ ''غسل'' ہو نہ کہ مسح، اور اس کی احترازی مثال ''مسح علی الرأس'' ہے کہ جس کے ''غسل'' کے بارے میں کوئی فضیلت والی روایت موجود نہیں ہے۔ (ایضا)

نقل مذاہب میں احتیاط

نقل مذاہب کے حوالے سے بھی حضرت اورکزئی رحمہ اللہ کی تحقیق قابل ستائش ہے، جس میں احتیاط کے پہلو کو خاص ملحوظ رکھا گیا ہے اور نہایت جامعیت کے ساتھ حضرت نے مذاہب نقل کیے ہیں، اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مذکورہ باب میں ''تلخیص'' کے تحت امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے حوالے سے مشہور مغالطے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لوگوں کے درمیان مشہور ہے کہ امام موصوف مسح علی القدمین کے قائل تھے، حالانکہ ہرگز ایسا نہیں اور یہ بہت بڑی غلطی ہے''۔ مزید فرماتے ہیں: ''تفسیر طبری میں انہوں نے قائلین مسح پر مضبوط رد کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے بھی ان کے مذہب کو صحیح پر نقل کیا ہے، لیکن باوجودیکہ یہ دونوں تفسیریں لوگوں میں معروف ومتداول ہیں، پھر بھی غلطی کرنے سے محفوظ نہ رہ سکے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مفسرین نے اس بے بنیاد حقیقت کی بنیاد پر ان کو رافضی تک کہہ دیا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون! (ایضا)

(۲) نقل مذاہب میں احتیاط کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں: '' باب الرجل یخرج من ذکرہ المذی کیف یفعل؟'' کے تحت ''شرح معانی الآثار'' میں یہ عبارت مذکور ہے:

''قال ابو جعفر: فذھب قوم الی ان غسل المذاکیر واجب علی الرجل اذا امذی واذا بال''.

اس عبارت کے تحت علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ "نخب الافکار" میں یوں رقم طراز ہیں:

"اراد بالقوم هناالزهری وبعض المالکیة والحنابلة؛ فانهم اوجبوا غسل المذاکیر اذا مذی".

ان "اذا بال" کے لفظ پر حافظ رحمہ اللہ کی طرف سے کوئی توضیح منقول نہیں، یہ بات چونکہ متن کی ہے، اس لئے سنجیدگی کا پہلو مزید بڑھ جاتا ہے، حضرت شہید رحمہ اللہ کی باریک بینی نے اس اہم پہلو کو محسوس کرتے ہوئے انہیں توضیح کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ "تلخیص" میں لکھتے ہیں:

"اطلاعا عرض ہے کہ "اذا بال" کے لفظ سے علما کے اختلاف کا جو تاثر ملتا ہے، اس بارے میں ہم نہیں جانتے، اور درحقیقت اس میں کوئی اختلاف ہے بھی نہیں، بول کی صورت میں "غسل جمیع المذاکیر" اتفاقی مسئلہ ہے"۔

پھر امام طحاوی رحمہ اللہ کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "لعله من زيادة النساخ، والله اعلم". (ص: ۹۴)

روات حدیث کے بیان میں احتیاط

روات حدیث کے حوالے سے بھی حضرت نے تحقیقی ذوق کا مظاہرہ فرمایا ہے:

(۱) "باب المسح على الخفين كم وقتا للمسافر والمقيم" (ص:۱۸۲) میں حضرت ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ کے تحت لکھتے ہیں:

"شاید یہ عمرو بن اخطب بن رفاعہ خزرجی ہیں، جو کنیت سے مشہور ہوئے، لیکن اس کنیت کے ساتھ اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ہیں، جیسے جامعین قرآن میں سے ابوزید انصاری، لیکن اس بات کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے کہ ابوزید سے امام طحاوی کی مراد کون ہیں؟ حافظ عینی نے یہاں بیاض چھوڑ دی ہے اور تعیین نہیں کی اور ان کے نسخہ میں "عن رجل" 'عن' کی زیادتی کے ساتھ آیا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، جیسے سنن ابومسلم کجی کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے"۔

یقیناً یہ تحقیق بہت اہم ہے، جس میں اغماض کے بجائے وضاحت سے کام لیا گیا ہے۔

(۲) ایک اور مثال بھی حضرت شہید رحمہ اللہ کے شاندار اسلوب تحقیق پر دلالت کرتی ہے، "باب مس الفرج هل يجب فيه الوضوء ام لا؟" (ص:۱۵۲) کے تحت لکھتے ہیں:

"ربیعہ سے روایت کرنے والے راوی کے بارے میں نسخوں کا اختلاف ہے کہ ربیعہ سے مراد کون راوی ہے؟ تمام مطبوعہ نسخوں اور "کشف الاستار" میں "زید عن ربیعہ" ہے، حافظ عینی والے نسخے میں "ابوزید عن ربیعہ" ہے اور اس کی تائید مطبوعہ نسخہ کی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے، اور صاحب السعایہ (مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ)

نے ''ابن یزید'' کہا ہے، پھر اس کی تعیین میں بھی اختلاف ہے، حافظ عینی نے اسامہ بن زید لیثی کو مصداق قرار دیا ہے، ''صاحب الکشف'' نے زید بن الحباب، ''صاحب الامانی'' نے عبدالرحمٰن بن زید اور علامہ محمد ایوب سہارن پوریؒ نے یونس بن یزید الایلی کو مصداق قرار دیا ہے اور بندہ ضعیف کی بھی یہی رائے ہے''۔

راویوں کی تحقیق میں اس قدر دقت کا مظاہرہ ''فن اسمائے رجال'' میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مسئلہ ''نبیذ تمر'' کی تحقیق

فقہائے حنفیہ کو عموماً ایک اہم معرکہ جو پیش آتا رہتا ہے، وہ ان مسائل کی تحلیل ہے جن میں بیشتر ظاہر بینوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے صریح قیاس اور شعور عقلی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل بالحدیث کے پہلو کو یکسر نظر انداز یا کم از کم ثانوی حیثیت دے کر منشائے شریعت کے خلاف عمل کو روا رکھا ہے، مثلاً: ''بیع مصراۃ'' کا مسئلہ اور ''نبیذ تمر'' کے استعمال میں بجائے حرمت کے حلت کو ترجیح دینا، اگرچہ امام صاحب سے منقول ہزاروں مسائل کی بنیاد حدیثی استدلال پر ہی ہے اور یہ حقیقت بھی واشگاف ہے کہ امام صاحب نصوص کے الفاظ کو بجائے خود تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کے ہاں مقاصد شریعت کا فہم ہی اصل منہج ہے، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب آثار صحابہ کو مقاصد شریعت تک رسائی کے لیے ماخذ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ صحابہ کو صاحب وحی کی قربت نے فہم شریعت عطا کر دیا تھا، اور یقیناً وہ رموز و اسرار شریعت کے ساتھ احکام شریعت کو خوب سمجھتے تھے۔

بہر کیف حضرت مولانا رحمہ اللہ، امام صاحب کی فقہی گہرائی و گیرائی سے واقف تھے، اس لئے ''ابواب الطہارۃ'' میں ''نبیذ تمر'' کے مسئلہ میں ان کا قلم امام طحاوی رحمہ اللہ کی موافقت نہیں کر پایا اور انہوں نے بلا جھجک اختلاف کو ترجیح دیتے ہوئے ''نبیذ تمر'' میں امام صاحبؒ کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کیا ہے، مختصراً چند امور قابل ذکر ہیں:

''نبیذ تمر'' کے مسئلہ میں فقہائے احناف عموماً احتیاط کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے امام صاحب کی طرف رجوع کا قول بھی منسوب کرتے ہیں، لیکن ''معارف السنن'' میں حضرت بنوری رحمہ اللہ نے امام صاحب کی اصل رائے کی تائید و دفاع میں علمی بحث کا حق ادا کیا ہے، حضرت شہید بھی اسی پر عمل پیرا رہے، البتہ استاد و شاگرد میں تفصیل و اختصار کا فرق ضرور ہے، مضمون کی طوالت سے اجتناب کرنے کے لیے ہم صرف حضرت اورکزئی رحمہ اللہ کی طرف سے امام صاحب کے مذہب پر وارد اعتراضات کے جوابات نقل کرتے ہیں:

۱۔ لفظ ''الماء'' کو قرآن نے آیت تیمم میں سیاق نفی میں ذکر کیا ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے اور لسان نبوت ''نبیذ'' کو ''الماء'' قرار دے چکی ہے۔

۲۔ ''وضو بالنبیذ'' کی روایت کو حضرت ابن مسعودؓ سے پندرہ راویوں نے نقل کیا ہے۔

۳۔ اتنی بڑی تعداد میں روایات سے ''نسخ الکتاب'' یا کم از کم کتاب اللہ پر زیادتی کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ آیت تیمم میں ''الماء'' مذکور ہے، جو ''عام مخصوص منہ البعض'' ہے، لہٰذا قیاس بھی اس کے لیے ''مخصص'' ہوسکتا ہے، چہ جائیکہ حدیث حسن صحیح بھی اس کی تائید کرتی ہو۔

۵۔ حدیث نبیذ کے رواۃ پر جرح نا قابل قبول ہے، اس لئے کہ ان کی تعدیل بھی ثابت ہے۔

۶۔ ''لیلۃ الجن'' چھ مرتبہ ثابت ہے، لہٰذا نفی کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

۷۔ جب احتمال کا ثبوت پیدا ہوگیا ہے تو ابن مسعودؓ کے فرزند ابوعبیدہؒ کا استدلال باطل قرار دیا جاسکتا ہے۔

۸۔ یہاں امام صاحب نے آثار مرفوعہ کو منشائے شریعت قرار دیا ہے، جن کی بڑی تعداد ہے (اس بات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے)۔

۹۔ ثبوت نسخ کے لیے کوئی دلیل شافی موجود نہیں۔

امام طحاویؒ کی ''نظر'' کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ وہ نظر تو مقبول نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ نظر میں حضر اور سفر کے فرق کو عمل اجماعی قرار دیا گیا ہے، حالانکہ کبھی پانی کی موجودگی کی صورت میں بھی تیمم جائز ہوتا ہے تو اجماع صرف دعویٰ تک محدود ہے، حقیقت اجماع ہرگز موجود نہیں۔

مذکورہ بالا نکات حضرت شہید رحمہ اللہ کی ''تلخیص'' کی روشنی میں رقم کئے گئے ہیں، اور اس مقام کے پیش نظر ہم نے اختصار کو ترجیح دی ہے، اگر کہیں پیچیدگی محسوس ہو تو قارئین اصل کتاب کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں، اس تحقیق کے بعد حضرت شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مذکورہ سطور حصول صواب کے لیے کافی ہیں اور یقیناً حق بھی وہی ہے جو امام صاحب نے فرمایا ہے، اس لیے کہ:

اذا قالت حذام فصد قوها فان القول ماقالت حذام (نثر الازھار ص: ۲۰۳ و ۲۰۴)

حضرت رحمہ اللہ کی علمی زندگی مذکورہ بالا تحقیقات سے معمور نظر آتی ہے، یہی حضرت کی ذات اقدس کے لیے سرمایہ حیات بھی ہے اور سرچشمہ حیات بھی، حضرت کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف احوال کو ان کی علمی زندگی کے اس نوع کے زندہ و تابندہ کارناموں کے ساتھ جوڑا جائے تو عاملین شریعت اور حاملین اسرار نبوت سے مزین ایک رجل باصفا دکھائی دیتا ہے، جو غیرت وحمیت میں اپنے آباواجداد کی اسلامیت پسندی کا پرتو تھا، مشتاق نگاہیں ان کے وجود مثالی کا تصور کر کے ذاتی اوصاف کے پہلو سے ان جیسے مردان کار سے زمانے کو تہی دامن پاتی ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ کی کامل مغفرت فرمائے اور ان کے علمی سرچشموں کو یونہی رواں دواں رکھے، آمین!